(غلام گردش)

کٹھ پتلیاں

ہفتہ میں ایک دن، جسٹس صاحب اور میں اکٹھے واک کرتے ہیں۔ جگہ وہی جسکے سامنے تمام خوبصورت ترین مقام ہیچ ہیں۔ یعنی لارنس گارڈن جسے اب باغِ جناح کہا جاتا ہے۔ نام کیوں بدلا گیا اسکا کوئی اندازہ نہیں۔ لاہور کا یہ خوبصورت ترین باغ تو لارنس نام کے انگریز افسر نے بنایا تھا۔ نام سے منسوب مقام کو اسی عظیم شخص سے وابسطہ رہنا چاہیے تھا۔ ہم بذات خود بڑے کام سرانجام نہیں دے سکتے، لہذا نام تبدیل کر کے عظمت کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ رائیگاں سی کوشش۔ منٹگمری کا شہر ساہیوال قرار پایا۔ کیمل پور، اَٹک بن گیا۔ لائل پور، تبدیل ہو کر فیصل آباد بن گیا۔ ہم نئے شہر تو بنا نہ پائے، صرف اور صرف نام بدلنے سے ذہنی تسکین حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

بات جسٹس صاحب کی ہو رہی تھی۔ ہائیکورٹ سے ریٹائر ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ دوستی جمخانہ کلب کی لائبریری میں ہوئی تھی۔ اتفاق سے وہ بھی Stanley wolport کی وہی کتاب ڈھونڈ رہے تھے جو میں تلاش کر رہا تھا۔ تھک ہار کر لائبریرین کے پاس پہنچے تو دونوں نے بیک وقت کہا کہ فلاں کتاب مل نہیں رہی۔ لائبریرین نے دونوں کو یک آواز ہو کر کتاب کے متعلق سنا تو سارے ہنسنے لگے۔ خیر کتاب تو نہ مل سکی۔ مگر جسٹس صاحب سے دوستی ضرور ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی باغ جناح میں سیر کرتے ہیں۔ میں ہفتے میں ایک بار وہاں ضرور جاتا ہوں۔ سینکڑوں سال پرانے درختوں سے سرشار ہوتا ہوں۔ خوبصورت ترین پھولوں کی گفتار سے محظوظ ہوتا ہوں۔ جسٹس صاحب کا وطیرہ ہے کہ بلاناغہ دو دہائیوں سے لارنس گارڈن کے قدرتی حسن کے اسیر ہیں۔ خیر چار سال پہلے طے ہو گیا کہ ہفتہ میں ایک دن اکٹھے واک کیا کرینگے۔ یہ معاملہ سورج طلوع ہونے سے پہلے شروع ہوتا ہے اور تقریباً ساڑھے چھ ختم ہو جاتا ہے۔ جسٹس صاحب کی جیب میں الیکٹرونک سگار ہوتا ہے۔ سیر کے بعد، ہم دونوں ایک خاموش سی جگہ پر پتھر کے بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ جسٹس صاحب سگار کے چند کش لگاتے ہیں۔ اسکے بعد تھرمس سے کافی نکال کر پلاسٹک کے کپوں میں سڑک سڑک کے پینی شروع کر دیتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے میں دنیا جہان کے متعلق دلیل سے گفتگو ہوتی ہے۔ بحث ہوتی ہے۔ تکرار ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ناراضگی بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہم ایک دوسرے کی دلیل کو ضعیف قرار دیکر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جج صاحب کو منانا بے حد آسان ہوتا ہے۔ جیب سے پرندوں کیلئے لفافے سے اناج نکالتا ہوں اور گھاس پر پھینکنا شروع کر دیتا ہوں۔ آدھے دانے ناراض جسٹس صاحب کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ جیسے ہی اناج زمین پر گرتا ہے، درختوں سے درجنوں رنگ برنگے طوطے، کالی سیاہ مینائیں، بلبلیں اور چھوٹی چھوٹی معصوم سی چڑیاں ہمارے اردگرد جمع ہو جاتی ہیں۔ میں اور جج صاحب یہ خوبصورتی دیکھ کر مسکراتے ہیں اور ہماری صلح ہو جاتی ہے۔ باغ جناح میں اجنبی پرندوں کو غذا پہنچانے سے دل کو سکون ملتا ہے۔ آپ بھی اس کلیے کو آزمائیے۔ گھر میں جو کچھ بھی اضافی کھانا ہے اسے کسی کھلی جگہ یا اپنی چھت پر ڈال دیجئے۔ پرندے دوست بن جائینگے اور آپکو دلی سکون بھی نصیب ہوگا۔ وہ سکون جسکی تلاش میں ہر ذی روح بے چین اور بے قرار ہے۔

پچھلے ہفتے، جسٹس صاحب سے سوال کیا۔ کہ ہمارے ملک کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ ٹھیک کیوں نہیں ہو رہا۔ عذاب در عذاب میں کیوں مبتلا ہے۔ میری اور انکی دس منٹ سے ناراضگی چل رہی تھی۔ وہ دوسری طرف منہ کر کے، پرندوں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ سوال پر بے حد سنجیدہ ہو گئے۔ کچھ لمحوں کیلئے گھنے درختوں کی طرف دیکھ کر سوچتے رہے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ سوال کا جواب جھومتے ہوئے درختوں سے پوچھ رہے ہیں۔ پھر متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ ڈاکٹر، یار، تو نے بہت مشکل سوال کر دیا ہے۔ اسکا ایک جواب تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پر میں نے ہمت کر کے اتنے مہیب سوال کا ایک جواب تلاش کر لیا ہے۔ پر اس وقت تک نہیں بتاؤنگا، جب تک تم سگار پینے سے نہیں ٹوکو گے۔ جج صاحب کے الیکٹرونک سگار پر میری تنقید مسلسل جاری رہتی ہے۔ بہرحال میں نے اجازت دیدی۔ جج صاحب نے تین چار کش لیے اور پھر کہا، جب لندن سے قانون کی ڈگری لیکر آیا تو عمر صرف اٹھائیس برس تھی۔ پندرہ سال کے قریب عدالتوں میں بطور وکیل پیش ہوتا رہا۔ ہر طرح کی زیادتی، جبر اور ظلم کے خلاف اپنی بساط کے مطابق لڑتا رہا۔ دس فیصد سائلین سے تو فیس بھی نہیں لیتا تھا۔ جیلوں میں جا کر قیدیوں کی حالتِ زار دیکھتا رہا۔ محنت کرتا رہا۔ پیسے کماتا رہا۔ مگر نتیجہ صفر بٹہ صفر۔ کوئی ایسا بڑا کام نہ کر سکا جس پر کہہ سکوں کہ واقعی زندگی کا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ پھر لاہور ہائیکورٹ کا جج بن گیا۔ پوری زندگی مقدمات سنتا رہا۔ سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق ڈھونڈتا رہا۔ کبھی انصاف دے پایا۔ مگر اکثر مواقع پر ناانصافی سے ہی کام چلاتا رہا۔ اسلیے کہ انصاف دینے کیلئے تو ٹھوس ثبوت اور شواہد چاہیے۔ اسی فیصد مقدمات میں یہ ناپید ہوتے ہیں۔ لہذا، انتہائی مجبوری میں ملزموں بلکہ مجرموں کو چھوڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اگر ہمت کر کے، ان لوگوں کو سزا دے دیتا تھا تو سپریم کورٹ انہیں باعزت بری کر دیتا تھا۔ مجھ سے پوچھا جاتا ہے تھا کہ مضبوط شواہد کے بغیر سزا کیسے سنا دی۔ حالانکہ ہم سب کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ بری ہونے کے بعد دندناتے پھرینگے۔ یہ قاتل ہیں، خونی ہیں، ڈاکو ہیں، قبضہ گروپ کے سرغنہ ہیں۔ گردوں کی فصیل بیوکاری کرتے رہے ہیں۔ ہائیکورٹ کا جج ہونے کے باوجود مکمل طور پر بے بس تھا۔ جج صاحب کو یاد کروایا کہ جناب آپ سے ملک کا اصل مسئلہ پوچھا ہے اور آپ، آپ بیتی سنانے لگے۔ جسٹس صاحب نے گہری سوچ میں نزدیک بیٹھے ہوئے لمبی دم والے رنگ برنگے طوطے کو انتہائی غور سے دیکھا۔ جواب دیا، ڈاکٹر! ہمارے ملک کا اصل اور جوہری مسئلہ "پراسس" ہے۔ ہم تمام لوگ، قانون کی بالادستی میں سانس نہیں لے رہے۔ بلکہ ضابطے کی ترتیب شدہ ظالمانہ ہوا میں جینے پر مجبور ہیں۔ ضرور پوچھو گے کہ میری بات کا مطلب کیا ہے۔ جج صاحب، نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

پراسس اور ضابطہ، پراسس اور ضابطہ۔ ایسے لگ رہا تھا کہ میرے وجدان کو کوئی انسان، اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر تالیاں بجا رہا ہے۔ جج صاحب یہ آپ نے کیسی بات کر دی۔ تفصیل سے بتایئے۔ کہنے لگے۔ کسی سرکاری دفتر میں چلے جائیں۔ چلیے، مثال کے طور پر کسی سیکرٹری کے پاس سائل بن کر پیش ہوں۔ آپکو کسی قسم کا کوئی سرکاری یا نجی کام ہے۔ آپکے لیے اسکی اَز حد اہمیت ہے۔ اندازہ ہے کہ اگر اس کام میں تاخیر ہو گئی تو ناقابل یقین حد تک نقصان ہو گا۔ مثلاً اپنی پوسٹنگ اس جگہ کروانا چاہتے ہیں جہاں آپکی ضعیف والدہ زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے۔ ہر گھڑی اسکی نظریں چوکھٹ پر لگی رہتی ہیں کہ کب میرا بیٹا آئیگا اور مجھے بڑے شہر میں بڑے ڈاکٹر کے پاس لیکر جائیگا۔ آپکے لیے والدہ سے بڑھ کر کوئی اثاثہ نہیں۔ مگر دفتری بابو، جائز بات سنکر کہے گا کہ فوری طور پر درخواست

دیں۔رپورٹ منگوا کر دیکھونگا۔پھر فیصلہ ہوگا۔جواب سنکر دل بیٹھ جائیگا۔دفتر سے باہر جا کر کسی کی منت سماجت کرینگے۔درخواست لکھ کر دوبارہ دفتر میں جائینگے تو معلوم ہوگا کہ صاحب میٹنگ میں ہیں۔درخواست پی اے وصول کریگا اور اسکے بعد حکم ہوگا" کچھ دن بعد آجایئے"۔درخواست پھر ایک دفتر سے دوسرے دفتر، وہاں سے تیسرے، پھر چوتھے اور پھر پانچویں یا دسویں دفتر چلی جائیگی۔دیوانوں کی طرح اپنے جائز کام کیلئے ایک بابو سے دوسرے اور پھر اَن گنت بابوؤں کے کمروں میں دھکے کھاتے رہینگے۔والدہ کی طبیعت بدستور بگڑتی رہیگی۔بہنیں بار بار فون کرینگی کہ کیوں نہیں آرہے۔والدہ صرف آپکو یاد کرتی ہیں۔درخواست کو نیچے تک آنے میں تین چار ہفتے یا دو تین مہینے صَرف ہو چکے ہونگے۔اس عرصہ میں آپکی عزتِ نفس کا کچومر بن چکا ہوگا۔ذہنی حالت یہ ہوگی کہ کسی بھی طاقتور آدمی کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جائینگے، تاکہ سفارش کرواسکیں۔یا قرض پکڑ کر بابوؤں کو رشوت دینگے۔ہاں جہاں آپ رشوت دینگے، وہاں ایک بورڈ پر رشوت کے متعلق دینی احکامات بھی درج ہونگے۔مگر پھر صرف فون کی گھنٹی بجے گی۔اطلاع آئیگی کہ والدہ تو انتظار کر کر کے اب دنیا ہی سے رخصت ہوگئی۔روتے ہوئے گھر جائینگے اور پھر ایک نئے صدمہ کو سہنے کیلئے تیار ہو جائینگے۔جسٹس صاحب کہنے لگے کہ سکے کا دوسرا رخ بھی ہے۔دفتر کے سیکرٹری سے پوچھیں کہ بھئی یہ تبادلے کا جائز کام کیوں نہیں ہوا۔تو اسکا جواب فٹ سے آئیگا۔کہ میں نے ہر کاغذ قانون اور ضابطے کے حساب سے دیکھنا ہے۔مجھے کیا پتہ کہ جہاں یہ بندہ اپنا تبادلہ کروانا چاہتا تھا، وہاں خالی سیٹ ہے بھی کہ نہیں۔وہاں پر موجود اہلکار کو کتنا وقت ہوا ہے۔میں تو ضابطے کی کاروائی کے بغیر کوئی حکم جاری نہیں کرسکتا۔جج صاحب کہنے لگے۔یہاں برباد ہونے والا بھی ضابطے کے ہاتھوں خوار ہو رہا ہے اور ذلیل کرنے والا بھی ضابطے کا سہارا لے رہا ہے۔

جسٹس صاحب نے سگار کا ایک گہرا کش لگایا۔دھواں ناک سے باہر آیا تو تمام پرندے خوف سے اُڑ گئے۔کہنے لگے۔ڈاکٹر! پاکستان کے ہر ادارے، ہر دفتر، ہر عدالت، ہر سرکاری منصب کا بالکل ایک جیسا حال ہے۔عدالت میں ملزمان کو بلانے کا ضابطہ اس قدر ناقص ہے کہ تھوڑا سا ہوشیار انسان، اپنی پیشی کو سال دو سال آرام سے رکوا سکتا ہے۔اگر عدالت کا اہلکار آپکی گرم مٹھی میں ہے تو آپکو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔مقدمے کی فائل تک آپکے گھر لے آئیگا۔عدالت کی فہرست سے آپکی فائل کا وجود ہی ختم ہو جائیگا۔فائل غائب نہ بھی ہو، تو سمن جاری ہوتے رہینگے۔مگر آپ تک کبھی نہیں پہنچے نگے۔جج صاحب جو مرضی کرلیں، وہ ضابطے کی کاروائی کے بغیر فیصلہ نہیں کرسکتے۔اس پراسس کا سہارا لیکر آپ تمام معاملہ کو کھٹائی میں ڈال دینگے۔ہفتے مہینوں میں بدل جائینگے اور پھر سالوں میں۔مقدمہ وہیں کا وہیں رہیگا۔انگریز کے بنائے گئے ان غلامانہ ضابطوں کو تبدیل کرنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں۔نہ سیاسی وزیراعظم میں، نہ عدلیہ کے سربراہ میں اور نہ ہی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر میں۔ڈاکٹر، ہم سارے پراسس کے غلام ہیں۔ضابطے کے سامنے کٹھ پتلیاں ہیں۔بے بس بونے جو شکایت تو کرسکتے ہیں۔مگر دقیانوسی قوانین اور ضوابط کو بدلنے کا آزادانہ فیصلہ نہیں کرسکتے۔حالات جوں کے توں رہینگے۔آؤ، تھوڑی سی واک اور کرلیتے ہیں!

راؤ منظر حیات